

تفسیر "سورہ البقرہ" (آیات 26 تا 30)

<?xml encoding="UTF-8">

"إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيَ أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَبْعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا^١ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ^٢ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ (26)

بلاشبہ اللہ اس سے نہیں شرماتا کہ وہ مچھر یا اس سے بھی بڑھ کر کسی چیز کی کوئی مثال بیان کرے اب وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ یقیناً حق ہے انکے پروردگار کی طرف سے اور جو لوگ کفر اختیار کیے ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ آخر اللہ کا اس طرح کی مثال سے کیا مطلب ہے؟ وہ اس سے بہت سوں کو گمراہی میں ڈالتا ہے اور بہت سوں کی ہدایت کرتا ہے اور گمراہی میں نہیں ڈالتا مگر بد اعمالوں کو"

““

ذہن انسانی محسوسات سے مانوس ہے اس لیے وہ کسی حقیقت کا اس وقت تک آسانی کے ساتھ تصور نہیں کرتا جب تک کہ اسے کسی حسی شکل کی مثال دیکر اور مشاہدہ میں آئی ہوئی کسی واقعیت کی نظیر سامنے لاکر پیش نہ کیا جائے اسی لیے قرآن کریم میں حقیقتوں کے اظہار کے لیے مثالوں سے کام لیا گیا ہے اور اقسام قرآن میں "امثال" کو ایک مستقل جگہ حاصل ہے۔ اس میں جیسے بڑی چیزوں کی مثالیں ہیں جیسے آفتاب و ماہتاب وغیرہ ویسے ہی مخلوقات الہی میں بعض چھوٹی چیزوں کی مثالیں دی گئی ہیں جیسے ایک جگہ انسان کی عاجزی دکھانے کے لیے آیا ہے:

"وَأَن يَسْلُبَهُمُ الذَّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ ضَعُفُ الطَّالِبِ وَلَمُطْلُوبِ" (الحج#73)

اگر مکھی ان سے ذرا سی کوئی چیز چھین لے جاتی ہے تو یہ اسے اس کے ہاتھ سے چھڑا نہیں سکتے جیسی کمزور مخلوق وہ ویسے ہی کمزور یہ"

کون کہہ سکتا ہے کہ مقصد کلام کے لحاظ سے یہاں مکھی کے علاوہ کسی بڑے جانور مثلاً شیر، بھیڑیے وغیرہ کا تذکرہ بھی مناسب ہو سکتا تھا مگر معاندین کے لیے تو اعتراض کا کوئی بہانہ چاہیئے۔ انہوں نے اس کو سرمایہ اعتراض بنالیا کہ واہ خالق کائنات کے کلام ہونے کا دعویٰ اور اس میں مچھر مکھی ایسی حقیر مخلوق کا ذکر اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔

خدا اس سے نہیں شرماتا یعنی اسے اپنی اپنے کلام کی شان کے خلاف نہیں جانتا کہ اس میں مچھر یا اس سے بھی بڑھ کر یعنی اس سے بھی زیادہ چھوٹی کسی شے کی مثال دی جائے کیونکہ مثال کا مقصد تو کسی حقیقت کو ذہن سے قریب لانا ہوتا ہے۔ اب وہ حقیقت اگر بڑے قد و قامت والی چیز کے ذریعہ سے سامنے آتی ہے تو اس کی مثال دی جائیگی اور چھوٹی چیز کے ذریعہ سے یہ مقصد پورا ہوتا ہے تو اس کا ذکر کرنا بلاغت کے لحاظ سے ضروری ہوگا۔ جو صاحبان ایمان ہیں وہ مثال کے چھوٹے اور بڑے ہونے کو نہیں دیکھتے بلکہ اس حقیقت پر نظر کرتے ہیں جو اس کے تحت میں ہے اور اس سے ان کے علم و یقین میں اضافہ ہوتا ہے اور جو جان بوجھ کر کفر اختیار کیے ہوئے ہیں وہ بطور طنز و استہزاء کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ کا بھلا ایسی مثالوں سے کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ اب یہ فقرہ کہ "بہت سوں کو گمراہی میں ڈالتا ہے اور بہت سوں کی ہدایت کرتا ہے" ان ہی کافروں کے قول کا تتمہ بھی ہو سکتا ہے۔ گویا وہ اللہ پر تفرقہ اندازی کا الزام عائد کرتے ہیں کہ ایسی

مثالوں کا لانا اور زیادہ لوگوں کو شکوک پیدا کرنے کا ذریعہ ہے تو آخر اس سے فائدہ کیا ہے اور جواب اس کا اس کے بعد اللہ کی طرف سے یہ ہے کہ گمراہ تو صرف وہ ہوتے ہیں جو پہلے ہی سے بداعمال ہیں یعنی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں لہذا انکی گمراہی کا سبب حقیقۃً اللہ کا ان مثالوں کو پیش کرنا نہیں ہے بلکہ خود انکے سوء اختیار کا نتیجہ ہے کہ وہ اس سے گمراہ ہوتے ہیں۔(1)

دوسری صورت یہ ہے کہ کافروں کا کلام اس جملہ پر ختم ہوگیا کہ اللہ آخر اس سے چاہتا کیا ہے! اور اس کے بعد کلام الہی یہ ہے کہ اللہ اس سے "بہت سوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہت سوں کی ہدایت کرتا ہے" اس صورت میں یہ اس قبیل سے ہوگا جیسے اس سے پہلے :

"فی قلوبہم مرض فزادہم اللہ مرضاً"

حقیقت میں اللہ کو مقصود کسی کا گمراہ کرنا نہیں ہوتا لیکن چونکہ نتیجہ یہی مرتب ہوتا ہے کہ اس کی مثالوں سے کچھ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور کچھ اپنے تعصب و عناد سے مزید گمراہی میں مبتلا ہوتے ہیں اس لیے اسکی نسبت اللہ کی طرف دے دی گئی ہے اور پھر اسکی تشریح بعد میں کی گئی ہے کہ گمراہی ان ہی لوگوں کے لیے ہے جو پہلے سے راہ حق سے ہٹے ہوئے ہیں اور اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ گمراہی خود انسان کی بداعمالی اور سوء اختیار کا نتیجہ ہے نہ کہ اللہ کی طرف سے ہے خواہ مخواہ انکو گمراہ کرنے کا ارادہ ہے۔

بہر صورت آخری فقرہ "وما یضل بہ الا الفاسقین" سے یہ امر بالکل نمایاں ہے کہ گمراہ کرنے کی نسبت اللہ کی طرف عقیدہ جبر سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی۔(2)

**

"الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۖ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ (27)۔"

یہ جو اللہ سے کیے ہوئے معاہدہ کو اس کے استحکام کے بعد توڑ ڈیتے ہیں اور جس رشتہ کے ملائے رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اسے وہ کاٹ ڈالتے ہیں اور دنیا میں خرابی کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو گھاٹے میں رہنے والے ہیں"

یہ اوصاف ہیں ان فاسقین کے جن کیے لیے قرآنی امثال سے گمراہی کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے اور انکی یہ گمراہی طبیعت فسق کا نتیجہ ہے اس لیے یہی اوصاف مطلق فاسقین کے ہر دور میں قرار پائیں گے۔ اللہ سے کیا ہوا معاہدہ ان منافقین کے لیے جو اظہار اسلام کرچکے تھے کھلا ہوا ہے کیونکہ جب انہوں نے آکر رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے دست شفاء پر اسلام قبول کیا اور آپ (ص) کی رسالت کو تسلیم کیا تو اس سے وفاداری اور احکام کی تعمیل کا عہد و پیمان ظاہر ہے۔ اب جبکہ وہ اس کے بعد برابر رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے درپے آزار رہتے ہیں اور احکام قرآنی پر اعتراضات کے پہلو ڈھونڈتے رہتے ہیں تو انکے عہد شکنی کے مجرم ہونے میں شک ہی کیا ہوسکتا ہے۔ رہ گئے وہ کافر جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا انکے لیے یہ عہد وہ عہد فطرت ہوسکتا ہے جو اللہ کی خالقیت اور ربوبیت کے اقتضاء سے مطالبہ عبودیت کے طور پر ان سے بواسطہ عقل و ضمیر ابتدائے سن شعور ہی سے موجود ہے اور جس کے خلاف عمل کرنا اس عہد کو توڑنے کے مترادف ہے۔(3)

پھر اس عہد کی تجدید انبیاء و مرسلین علیہم السلام کی زبان سے بھی ہوتی رہی ہے جو یقیناً ہر ملک اور قوم میں ابتدائے تکوین بشر سے آتے رہے ہیں۔

اگرچہ زیادہ نمایاں مصداق اس کے یہود و نصاریٰ ہیں جو "اہل کتاب" کہلاتے ہیں۔ انکو پہلے سے نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی بشارتیں دے دی گئی تھیں۔ اب یہ اسے نہیں مانتے تو عہد شکنی نہیں تو کیا ہے؟ لطف یہ ہے کہ بائبل کا نام بھی خود یہود و نصاریٰ کی اصطلاح میں عہد ہی ہو گیا ہے۔ چنانچہ توریت اور اس کے ملحقات "عہد نامہ قدیم" (پرانا عہد نامہ) اور انجیل اور اس کے ملحقات "عہد جدید" (نیا عہد نامہ) کہلاتے ہیں۔

"جس رشتہ کے ملائے رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اسے توڑتے ہیں" اس میں تمام حقوق داخل ہیں "حقوق اللہ" بھی اور "حقوق الناس" بھی۔ رشتہ ملائے رکھنے کا مطلب ہے حقوق کو ادا کرتے رہنا اور توڑنے کا مطلب ہے ان حقوق کو ادا نہ کرنا بلکہ انکی عملی مخالفت کرنا۔ (4)

"فساد فی الارض" کی تشریح پہلے ہو چکی ہے۔ دوسروں کو کفر یا معصیت کی دعوت دینا اور خلق خدا کی گمراہی کا سامان کرنا بدترین قسم کا فساد فی الارض ہے اور ظاہر ہے کہ آیاتِ قرآن پر نکتہ چینیاں جو وہ لوگ کرتے رہتے تھے ان کا مقصد یہی تھا کہ لوگوں کے عقائدِ حقہ میں تزلزل پیدا کریں۔ "یہ لوگ گھاٹا اٹھانے والے ہیں" دنیا میں بھی کیونکہ کوئی جماعت ان پر اعتماد نہیں کرتی اور خود انکے دل کو سکون و اطمینان نصیب نہیں ہوتا اور آخرت میں بھی عذابِ ابدی کی شکل میں۔

**

"كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاحْيَاكُمْ ۖ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (28)۔

کس طرح تم اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے تو اسی نے تمہیں جاندار بنایا پھر وہی تمہیں موت دیگا اور وہی

تمہیں زندگی دے گا۔ پھر انجام میں اسی کی طرف تمہاری رجوع ہوگی"

"کس طرح" کا لفظ اصل میں تو سوال کو بتاتا ہے مگر کلامِ الہی میں جہاں بھی سوال کا کوئی لفظ آئے اس سے مقصود استفہام کے علاوہ کچھ اور ہی ہوتا ہے اس لیے کہ استفہام یعنی دریافتِ حال کا امکان اس کے لیے ہے جو حقیقت سے ناواقف ہو اور ظاہر ہے کہ خالق کی ذات "علام الغیوب" ہے کوئی بھی حقیقت اس سے مخفی نہیں ہے۔ لہذا کیونکر اور کس طرح سے بھی دریافتِ سبب مقصود نہیں ہو سکتا بلکہ اس سے زجر و توبیخ مقصود ہوتی ہے اور مطلب یہ ہے کہ تمہیں انکار نہ کرنا چاہیئے۔ (5)

کیوں نہ انکار کرنا چاہیئے؟ اس لیے کہ اللہ کی قدرت کے کرشمے خود تمہارے ہی اندر نمایاں ہیں۔ تم بے جان تھے ان مواد سے لیکر جن سے انسان کی خلقت ہوتی ہے شکم مادر میں اس وقت تک کہ جب تک اس میں جان پڑے وہ بے جان تھا۔ پھر جان ڈال کر اسے اس نے ذی حیات بنایا، پھر وہی اُسے عمر پوری ہونے پر موت دیتا ہے، پھر وہی دوبارہ زندہ کریگا۔ یہ حشر والی زندگی ہے جس پر مختتم جزاء و سزا کا دارومدار ہے۔ اس زندگی کے بعد حساب و کتاب وغیرہ منازلِ آخرت درپیش ہونگے اور اس کے بعد آخری انجام جو مومنین کا بہشت اور

کافرین کا دوزخ کی شکل میں نمودار ہوگا۔ یہ بھی خالق ہی کی جانب سے ہوگا اور فیصلہ صرف خالق کی مرضی پر موقوف ہے۔ اس معنی سے کہا گیا ہے "ثم اليه ترجعون" یعنی تمہارا معاملہ اس کے بعد اسی کے ہاتھ میں ہوگا۔ (6)

**

"هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَافِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمُوتٍ^٥ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (29)۔

وہ وہ ہے جس نے تمہارے لیے پیدا کیا جو کچھ زمین میں ہے سب ، پھر آسمان کی طرف رُخ کیا تو انہیں سات آسمانوں کی صورت میں درست کیا اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے"

؛؛؛

یہ انسانی رفعت و عظمت کا وہ پیغام ہے جو اسلام کا طرہ امتیاز ہے اور جسے پیش نظر رکھنے سے ہر قسم کے شرک یعنی غیر اللہ کی پرستش کا سدباب ہوتا ہے۔ انسان نے کائناتِ عالم کو دیکھ کر اُن میں اپنے کو حقیر سمجھا۔ وہ جسامت میں پہاڑوں سے بہت کم نظر آیا، نشوونما میں درختوں سے بہت پیچھے دکھائی دیا، ضروریاتِ زندگی کے پورا کرنے میں جانوروں کا محتاج محسوس ہوا تو وہ انکے سامنے جھکنے لگا لیکن اگر وہ اسے پیش نظر رکھے کہ دنیا کی ہر چیز اس کے لیے پیدا ہوئی ہے اس لیے اسے ہر چیز سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے اور کسی کے سامنے جھکنے کی ضرورت نہیں تو کبھی ان میں سے کسی کو معبود نہ بناتا، ہاں احسان اس کا مانتا اور معبود اسی کو بناتا جو ان سب چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے اور جس نے اس انسان کو وہ قویٰ عطا فرمائے جن سے کام لیکر وہ ان تمام عالم کی چیزوں کو تسخیر کر سکتا ہے۔

زمین اور اس کے اندر کی چیزوں کے ذکر کے بعد یہ کہنا کہ "پھر آسمان کی طرف رُخ کیا" اس سے پتہ چلتا ہے کہ زمین کی خلقت آسمان سے پہلے ہے حالانکہ دوسری جگہ قرآن میں آیا ہے کہ :
"والارض بعد ذلك دحاها" (النازعات#30)

دونوں آیتوں کو ملا کر دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آسمان ایک واحد شکل میں زمین سے پہلے خلق ہوا۔ اس کے بعد زمین کی تخلیق ہوئی اور زمین کی خلقت کے بعد آسمان کو سات طبقوں پر تقسیم کیا گیا۔ اسی لیے "استویٰ" کے لفظ کے ساتھ "السماء" بطور مفرد آیا ہے اور اس کے بعد "سبع سموت" کی صورت میں اس کے درست کیے جانے کا ذکر ہے۔

یہ آسمان جو ہمیں نظر آتا ہے اگر "حدِ نظر" کا نام ہو تب بھی اس کے آگے کیا ہے اس کے متعلق کون بتا سکتا ہے؟ پھر جبکہ خالق خود اسے سات کی تعداد میں بتائے تو انکار کا سبب ہی کیا ہو سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم ان سات کی شکل و کیفیت کو نہ سمجھ سکیں۔

آخری فقرہ "وہو بكل شئی علیم" جیسے ہر دور کی سائنس کے بلند بانگ دعووں کو پیش نظر رکھ کر ہی لایا گیا ہے کہ آسمانوں کے بارے میں تمہارے سرمایہ حقیقت میں جہل کے سوا کچھ نہیں ہے پھر جہل کی بنیاد پر "علیم و خبیر خالق" کے بیان کی نفی کا حق تمہیں کہاں پہنچ سکتا ہے۔

ہاں اس سات کہنے سے بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ اس بارے میں ہئیتِ قدیم والوں کی تفصیلات کو قبول کرلیا جائے کیونکہ انکی بنیاد بھی ظن و تخمین کے سوا کچھ نہیں ہے۔

**

"وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (30)۔"

اور اس وقت جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک جانشین بنانا چاہتا ہوں انہوں نے کہا کیا تو اس میں ایسے کو نائب بنائے گا جو اس میں خرابی پھیلائے اور خون خرابہ کرے حالانکہ ہم تیری تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے اور تیری پاکیزگی کو سراہتے رہتے ہیں اس نے کہا یقین جانو کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ؛؛

یہ کائناتِ عالم میں اشرف المخلوقات انسان کی "آمد آمد" کا ذکر ہے جبکہ یہ مخلوق ابھی عالم انوار و ارواح میں تو تھا مگر دنیائے اجسام اس سے خالی تھی۔ اس کے اس عالم میں آنے سے پہلے خالقِ کریم نے اپنے فرشتوں کو اس کے آنے کی خبر دی۔

فرشتے نور سے پیدا کیے ہوئے صاحبِ احساس و شعور وہ مخلوق ہیں جن میں ہوا و ہوس اور جذبات کا پتا نہیں اور اس لیے سرشت ہی کے اعتبار سے معصوم ہیں۔ انکو خالق منتظر و مشتاق بنانا چاہتا ہے ایک نئی قسم کی مخلوق کا جو مادیت اور روحانیت کا مجموعہ ہوگا اور اسکی پہلی فرد آدم علیہ السلام ہیں جن کے آنے کی ملائکہ کو اطلاع دی جارہی ہے ان الفاظ میں کہ "میں زمین میں ایک جانشین قرار دینا چاہتا ہوں۔ جانشین کے کیا معنی؟ جو دوسرے کی نیابت میں کوئی ایسا کام انجام دے جس کا اصل ذمہ دار وہ دوسرا ہے۔ اب یہ جانشینی خواہ اصل شخص کی غیبت کی وجہ سے ہو یا انتقال کی وجہ سے اور خواہ اس لیے ہو کہ خود اُس کے لیے اس کام کے انجام دینے میں کچھ موانع پائے جاتے ہیں، خالق کی طرف سے جانشین کا مقرر کیا جانا اسی تیسرے سبب سے ہے۔

اصل میں خلائق کی ہدایت و تنظیم "تقاضائے ربوبیت" ہے، اس لیے اسکا ذمہ دار وہ خود ہے مگر وہ جسم و جسمانیات سے منزہ و مبرا ہے اور خلائق جنکی ہدایت کرنا ہے وہ مادیت کے شکنجہ میں اسیر ہیں لہذا بلاواسطہ اسکی طرف سے فیض حاصل کرنے کی ان میں صلاحیت نہیں۔ اس وجہ سے ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ ان ہی میں سے کسی نفس کاملہ کو اپنے فیوض کا مرکز بنا کر ہدایت و تنظیم ملت کا کام سپرد کرے اور وہ اس ہدایت کے فریضہ کو جو اصل میں اللہ سے متعلق ہے اسکی طرف سے انجام دیکر خلقِ خدا پر حجت تمام کرے۔ ان ہی خلفاء میں سے ہر ایک کا نام نبی اور رسول اور کسی وقت امام ہونا ہے جنکا تقرر صرف اللہ کے اختیارِ خاص سے وابستہ ہے اور کسی دوسرے کو اس میں دخل نہیں۔

امام جعفر الصادق علیہ السلام نے خلیفہ کے لفظ کے معنی بتائے ہیں :

"يَكُونُ حِجَّةَ لِي فِي أَرْضِي عَلَى خَلْقِي"

وہ روئے زمین پر میری مخلوق کے مقابلہ میں میری حجت تمام ہونے کا ذریعہ ہوگا" (تفسیر صافی)

علمائے جمہور بھی زیادہ تر اس سے متفق ہیں چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس کے معنی میں لکھا

ہے :

"يخلفني في الحكم بين خلقى و ذلك الخليفة هو ادم ومن قام مقامه في طاعة الله والحكم بالعدل بين خلقه" (7)
"خليفة الله في ارضه لاقامية احكامه وتنفيذ قضاياه" (8)

نسل انسانی خود اپنی اصلاح و فلاح کے لیے اسکی محتاج تھی اور محتاج ہے کہ اپنے کسی ہم جنس کے واسطہ سے شریعتِ الہی سے استفادہ کرے اور سلسلہ نبوت اسی غرض سے قائم ہوا ہے :

"وكذلك كل نبى استخلفهم الله فى عمارة الارض وسياسة الناس وتكميل نفوسهم وتنفيذ امره فيهم" (9)

اس کے علاوہ یہ ہے کہ خالق کائنات کے ساتھ اگرچہ تمام عوالم کا تعلق یکساں ہے بایں معنی کہ وہ سب کا خالق اور مالک ہے مگر نسبتی حیثیت سے عرش کو "سریرِ سلطنتِ ربانی" کا درجہ دیا گیا ہے اور اس کے لحاظ سے زمین اس شرف سے محروم ہے۔ لہذا خالق کو منظور ہوا کہ زمین بھی ایک دارالسلطنت ہونے کے شرف سے محروم نہ رہے۔ لہذا کہا گیا کہ میں زمین میں اپنا نائب قرار دینا چاہتا ہوں یعنی ایک ایسا شخص جو زمین میں بجائے میرے ہو۔

اب اس نائب کے متعلق چونکہ ملائکہ کو خالق کی طرف سے علم دیا جاچکا تھا کہ اسکی خلقت مٹی سے ہوگی نیز انہیں مٹی کے خواص معلوم تھے کہ اس سے پیدا شدہ مخلوق میں جذبات نفس جو سرمایہ جبگ و جدال ہوتے ہیں کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ انہیں انسان کے علمی جوہرِ کمال اور اس نوع کی معصوم ہستیوں کی عظمتِ کردار کا اس وقت علم نہ تھا اور اس لیے انکے ذہن میں یہ تھا کہ خود ان سے بڑھ کر کوئی مخلوق مقامِ عبودیت میں بلند اور تقربِ الہی میں ان سے آگے نہیں ہے۔ اب جو خالق کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ "میں زمین میں اپنا جانشین مقرر کرنے والا ہوں" اور "خلافتِ الہیہ" کا یہ منصب انہیں اپنے حاصل شدہ مراتب سے اونچا نظر آیا تو یہ امر اُنکو اپنے اب تک کے ذہنی مرتکزات اور حدودِ علم و ادراک کے خلاف محسوس ہوا لہذا فطری طور پر اُن میں ایک اضطراب پیدا ہوا جس نے اس سوال کی شکل اختیار کی "کیا اسے مقرر کیا جائیگا جو زمین میں خرابی پھیلائے اور خونریزی کرے؟" یہ سوال نہ اعتراض تھا نہ اس میں کوئی جذبہ مخالفت کار فرما تھا کیونکہ یہ باتیں ملائکہ کی عصمت کے خلاف ہیں بلکہ وہ صرف ایک قلبی اضطراب کا مظاہرہ تھا جو اُن کے قصورِ علم کا لازمی نتیجہ تھا۔

خالق نے فعلاً اُن کے سوال کا تفصیلی جواب نہیں دیا بلکہ مجمل طور پر ایسا جواب دیا جس سے پتہ چلتا تھا کہ قدرت کا راز ہے جس کا بتانا اس وقت مناسب نہیں ہے یا ملائکہ میں ابھی اس کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

**

(1). وهذا وجه حسن (مجمع البيان)

(2). ان الرجل اذا ضل باختياره عند حصول شيء من غير ان يكون لذلك الشيء اثر في اضلاله فيقال لذلك الشيء انه اضله (رازي)

(3). نقضهم لذلك تركهم الاقرار بما قد ثبت صحته لهم بالادلة (مجمع البيان)

(4). قبل معناه الامر بوصل كل من امر الله بصلته من اوليائه والقطع والبراءة من اعدائه وهذا اقوى لانه اعم ويدخل فيه الجميع (مجمع البيان)

(5). كيف في الاصل سؤال عن الحال - ومعناه في الاية التوبيخ (مجمع البيان)

(6). كما يقال رجع امرالقوم الى الامير ولا يراد به الرجوع من مكان الى مكان وانما يراد به ان النظر صار له خاصة (مجمع البيان)

(7). وہ میرا جانشین ہوگا میری مخلوقات کے درمیان حکومت کرنے میں، اور یہ جانشین آدم علیہ السلام تھے اور جو ان کے قائم مقام ہوئے اطاعتِ الہی اور خلائق کے درمیان عدالت کے ساتھ فیصلہ کرنے میں (ابن جریر عن ابن عباس و ابن مسعود رضی اللہ عنہما)

(8). اللہ کا جانشین اسکی زمین میں اس کے احکام کو قائم کرنے اور اس کے فیصلوں کو جاری کرنے میں (معالم)

(9). اسی طرح ہر پیغمبر ، ان سب کو اللہ نے خلیفہ بنایا زمین کے آباد کرنے اور لوگوں کا نظم قائم کرنے اور ان کے نفوس کو کمال کی منزل تک پہنچانے اور خدا کے فرمان کو ان کے درمیان جاری کرنے میں (بیضاوی)